© rasailojaraid.com

رنگِ خیال

عقیدہ وعمل کا باہمی تلازم

ہر شخص اپنے اعمال کے سبب گروی ہوگا۔ سوائے سیدھے ہاتھ والوں کے۔ وہ باغوں میں ہوں گے۔ مجرموں کے باب میں باہم پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے (پھر دوزخیوں سے پوچھیں گے) تم سقر (جہنم) میں کیسے پہنچے؟ کہیں گے ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ اور نہ ہم غریب و مستحق لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ بلکہ ہم مین میکھ نکالنے والوں کے ساتھ مل کر مین میکھ نکالا کرتے تھے۔ اور ہم فیصلہ کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں موت نے آپکڑا۔ (المدثر ۳۸ تا ۴۷)

رب کا قانون مکافات عمل اور ردِ عمل سے بندھا ہوا ہے۔ جس طرح ہر معلول اپنی علت کے ساتھ ہر مسبب اپنے سبب کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس قانون کی وضاحت اوپر کی آیات سے ہوتی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہوگا۔ صرف داہنے ہاتھ والے ہی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ بالفاظ دیگر عمل سے ہی نجات ہوگی اور عمل سے ہی ہلاکت۔ اس دن رہائی کی صورت بجز اپنے اعمال کے کوئی نہیں۔ جنکی تیاری کا وقت یہی دنیا ہے۔ آنکھ بند ہونے کے بعد نتیجہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

یہاں جہنم میں جانے کے چار اسباب بتائے گئے۔ مجرموں کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:

(۱) ہم نماز نہیں پڑھتے تھے / ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔

(۲) مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

(۳) قرآن کو ماننے کے بجائے اس میں اجتماعی طور پر مین میکھ نکالا کرتے تھے۔

(۴) جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے تھے۔

مذکورہ بالا چار جرائم میں سے تین کا تعلق اعمال کی دنیا سے اور ایک کا تعلق عقائد کی دنیا سے ہے۔ اگر کوئی شخص مرنے کے بعد جزا و سزا کا قائل نہ ہو تو اس کا ہر عمل لامحالہ اس کے عقیدہ کا نمائندہ ہوگا۔ پھر ایسے شخص سے کسی خیر کی توقع رکھنا بھی فضول ہوگا۔ کیونکہ اعمال انسانی کی اصلاح و درستگی کا بنیادی جوہر اسی عقیدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان دل سے تسلیم کرلے کہ مرنے کے بعد اس کے ہر عمل کا بدلہ ضرور مل کر رہے گا تو وہ کسی بھی عمل کو کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا کہ اسے یہ کرنا چاہیے یا نہ؟

اعمال صالحہ کی انجام دہی اسی عقیدہ کی رہین منت ہے۔ اسلام نے توحید و رسالت کے ساتھ اسے بھی اساسی عقیدہ قرار دیا ہے۔ عقیدہ و عمل نظریہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اعمال صالحہ کی پیدائش اور اس کی افزونی کا سبب بنتا ہے۔ عقیدہ، کسی حقیقت کو صرف مان لینے کا نام نہیں بلکہ وہ محرک عمل سے عبارت ہے اور اسی معنی میں اسے عملی نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(مدیر اعلیٰ)

مسلم مفسرین کو جدید افکار کا چیلنج

ڈاکٹر ریحانہ فردوس
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

انیسویں صدی کے آغاز میں جب مغرب کی استعماری طاقتوں نے دنیائے اسلام پر قبضہ کرنا شروع کیا تو ان کو اسلامی علوم سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہ دلچسپی کسی اخلاص پر مبنی نہ تھی بلکہ علمی طور پر وہ اسلام کے اندر ایسی خورد برد کرنا چاہتے تھے جس سے نئی نسل متاثر ہو خود مسلمانوں کو اس سے نفرت ہو جائے اور وہ اپنے دین کو بیکار اور خلاف عقل سمجھ کر رد کر دیں۔ انہیں مقاصد کے پیش نظر غیر مسلم اسکالرز نے اسلامی علوم کے ہر شعبہ میں کام شروع کیا اور اپنے طور پر تحقیق کا بہت بلند معیار پیش کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے طریقہ تحقیق، مسائل کے تجزیے اور طریقہ استنتاج میں اس قدر کشش تھی کہ نئی تعلیم کے فارغ شدہ بہت سے مسلمان ان کے فریب میں آگئے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

تمام اسلامی علوم کے بارے میں جو ان مستشرقین نے کام کیا اس کا احاطہ کرنا تو یہاں ممکن نہیں البتہ زیر نظر مقالے میں ہم ایک موضوع پر ضرور گفتگو کریں گے اور وہ ہے قرآنی علوم کے بارے میں مستشرقین کی تحقیق۔ اس سلسلے میں پہلے تو ان لوگوں نے قرآن کے مغربی زبانوں میں ترجمے کیے بالخصوص انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی میں۔ پھر کچھ بڑے مستشرقین نے ترجمے کے ساتھ تفسیر کی طرف بھی توجہ کی۔ اس طرح کی سب سے مشہور کتاب قرآن مجید کا وہ ترجمہ اور تفسیر ہے جسے جارج سیل نے 1862ء میں انگریزی زبان میں شائع کیا۔ اس کے بعد آج تک مغرب میں جتنے ترجمے ہوئے ہیں وہ سب کے سب اسی کے خوشہ چین ہیں۔ جو غلطیاں سیل (sale) نے کی تھیں وہی بعد کے مترجمین نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیں۔

سیل (sale) عربی زبان کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً اس نے یہ غلطیاں قصداً کی ہیں اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف اس متعصب ترجمے سے مغرب کے لوگوں کو اسلام سے بدظن کرے اور دوسری طرف مسلم تعلیم یافتہ طبقے کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں وہ سو فیصد کامیاب رہا۔ سیل (sale) جس طرح انگریزی ادب پر قدرت رکھتا تھا اسی طرح عربی میں بھی مہارت رکھتا تھا قرآن کے اس انگریزی ترجمے میں وہی شان وشوکت نظر آتی تھی جیسے لاطینی سے انگریزی میں بائبل کے ترجمے میں۔ اس ظاہری ملمع سازی کے پردے میں اس نے قرآن کے سینکڑوں مفاہیم اور مطالب بدل کر رکھ دیے۔ لیکن انگریزی داں طبقہ ترجمے کے اس ظاہری حسن سے بہت متاثر ہوا اور جب کوئی زبان وادب سے متاثر ہوتا ہے تو اس پر حسن بیان کا ہی اثر نہیں ہوتا بلکہ کلام کے معانی بھی آہستہ آہستہ دل میں گھر کر لیتے ہیں۔

لہٰذا جن مسلمانوں نے یہ ترجمہ پڑھا اس سے ان کے عقائد اور کچھ نہیں تو کم از کم مشکوک ضرور ہوگئے۔ ان کے دلوں میں تذبذب اور اندیشے ضرور پیدا ہوگئے۔ اور یہی سیل (sale) کا مقصد تھا۔ اس کے علاوہ سیل نے ایک کام اور کیا وہ یہ کہ اس نے قرآن کا ایک مقدمہ لکھا اور اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف ہے اور بڑی حد تک محرف ہو چکا ہے۔ قرآن میں بہت سی علمی اور ادبی خرابیاں پائی جاتی ہیں اور یہ کہ اس کے تمام مضامین یہودیت اور عیسائیت سے لیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیل (sale) کی ان آراء سے بعد کے مستشرقین بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں بعد میں پوری شرح وبسط کے ساتھ اس نظریے کو پیش کیا مثلاً ملاحظہ ہو۔

Richard Bell, The Origin of Islam in its Christian environment, London, 1926; The Quran, Edinburgh 1937 c.c. Torrey, The Jewish Foundation of Islam, New York, 1933.

قابل توجہ بات یہ ہے کہ کسی مسلم مفسر کے قلم سے آج تک اس "مقدمہ قرآن" کا علمی، مستند اور خاطر خواہ مدلل جواب نہیں لکھا گیا لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ علمی فساد جو اٹھارویں صدی کے وسط میں شروع ہوا تھا ابھی تک جاری ہے۔ سیل (sale) نے ترجمہ کے ساتھ جو تفسیر لکھی ہے وہ مقدمہ قرآن

سے بھی زیادہ زہر آلود ہے اس نے قرآن کی آیات میں ہر طرح کا نقص پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مغرب میں آج تک قرآن پر جو کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ سب اسی ترجمے اور تفسیر کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں John Wansbrough کی Quranic Studies کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مغرب میں دوسرا شخص جس نے قرآن پر سب سے زیادہ کام کیا ہے وہ آسٹریا کا یہودی مستشرق گولڈزیہر ہے۔ اس نے اسلامی عقائد اور علوم پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں بلا مبالغہ ہر ایک کو مغرب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ انہیں میں سے ایک کا نام ہے "مذاہب التفسیر الاسلامیہ" اس کتاب میں گولڈزیہر نے جہاں مختلف مذاہب تفسیر سے بحث کی ہے اس کتاب کے شروع میں اس نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن میں بڑے پیمانے پر تحریف ہو چکی ہے اور اسی تحریف کی وجہ سے معنوی تحریف پیدا ہوتی ہے۔ اس کتاب کا اثر یہ ہوا کہ قرآن کے پڑھنے والے غیر مسلم خواہ مغرب میں ہوں یا مشرق میں عام طور پر سمجھنے لگے ہیں کہ واقعی متن قرآن میں ابتدا ہی سے گڑبڑ ہو چکی تھی اور بعد میں اس کی اصلاح ممکن نہیں تھی۔ گولڈزیہر نے عربی تفسیروں سے بے شمار آیات کو لے کر ان کی متداول روایات نقل کی ہیں۔ اس طرح اس نے اپنی دانست میں قرآن میں تحریف کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ یہ دوسری بڑی کتاب ہے جس نے دور جدید میں مغرب میں قرآن کے مطالعے پر گہرا اور منفی اثر ڈالا ہے۔ مغرب کی یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم میں دلچسپی رکھنے والے اساتذہ اپنی ہر بات اور اسلام کے بارے میں اپنے تصورات کو گولڈزیہر کے کتابوں سے حوالے دے کر مستند قرار دیتے ہیں۔

پچھلی صدی کے آخر میں ایک مشہور جرمن یہودی مستشرق نولڈیکے (Noldeke) نے قرآن کی تاریخ لکھی۔ یہ تاریخ نامکمل تھی بعد میں اس کے شاگرد شوالی (Schwally) نے اس کو آگے بڑھایا۔ پھر اس کے شاگردوں نے اس کی تکمیل کی یہ کام تقریباً پچاس برس میں مکمل ہوا۔ اور یہ مغرب میں قرآن کے خلاف ایک منظم کارنامہ ہے یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو بڑے سائز کے ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

See: Theodor Noldeke, Geschiehte des Qoran, revised by Fried rich Schwally.

اس کتاب میں بھی بڑے منظم انداز میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن محرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ گولڈ زیہر نے جو کام چھوٹے پیمانے پر کیا۔ نولڈ کیے اور اس کے شاگردوں نے بڑے پیمانے پر کیا اور ثابت کیا کہ قرآن کی عبارت ہر جگہ سے بدلی ہوئی ہے۔ اس میں ایسا لسانی اور ادبی سقم ہے کہ اس کو الہامی کتاب تو کیا ادب کا کوئی اچھا نمونہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نولڈ کیے نے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کے وہ علوم جو یہودیت اور عیسائیت سے تعلق نہیں رکھتے وہ بالکل بیکار اور بے معنی ہیں۔ پھر اس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ کہ یہ تمام تر وحی الٰہی ہے بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے۔ لہٰذا نولڈ کیے کے خیال میں نہ تو قرآن ادبی اعتبار سے کسی توجہ کے لائق ہے اور نہ علمی لحاظ سے اور دینی اعتبار سے تو بالکل ہی بے کار ہے۔

آج مغرب کا ہر مستشرق اس کتاب کو پڑھتا ہے اور اس سے متاثر ہوتا ہے اس کے بعد اسلام پر تحقیق شروع کرتا ہے۔ اسلامی ممالک سے جو مسلمان اعلیٰ تعلیم اور پی ایچ ڈی کے لیے مغرب میں ان اساتذہ کے پاس جاتے ہیں وہ اپنے شاگردوں کو انہیں مآخذ کی طرف رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کو وہی کچھ بتاتے ہیں جو انہوں نے بیل، گولڈ زیہر اور نولڈ کیے سے وراثت میں حاصل کیا ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر بیل (Bell) نے قرآن کو نزول کے اعتبار سے ترتیب دیا چنانچہ اس نے کانٹ چھانٹ کر کے ایک نیا قرآن تیار کر دیا۔ اس ترتیب سے قرآن کی عبارت اور مفہوم گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس نئی ترتیب کے ذریعے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات بدلے اور برابر قرآن کو بدلتے رہے۔

بیل کہتا ہے کہ ناسخ ومنسوخ کا مسئلہ اسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ترتیب نزولی کے اس نظریہ میں بظاہر بہت جاذبیت نظر آتی ہے کیونکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اسلام کی ترقی اور رفتار کا صحیح پتہ چل سکتا ہے۔ مشرکین، یہود ونصاریٰ سے تعلقات اور طرز سلوک میں تبدیلی، تمام باتوں کا علم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ قرآن مجید ایک سو چودہ ابواب میں بٹا ہوا ہے اور یہ تقسیم توقیفی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور سورتوں کی ترتیب وتنظیم اس کے نفس مضمون کے اعتبار سے ہے اور ان کو اسی طرح مرتب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ خدا نے چاہا اور جس طرح اس کی رسول کو ہدایت کی تھی اور یہ معلوم ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی کئی سورتوں کے اجزاء نازل ہوئے تھے۔ جنہیں آنحضرت کاتبین وحی سے لکھوا دیا کرتے تھے۔ اس لیے اگر ان کے نزول کا وقت

معلوم بھی ہو جائے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔

رہا مسئلہ تدریج کا تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ مکہ میں تیرہ برس کے دوران قرآن کے جو اجزاء نازل ہوئے اس میں صرف دعوت وارشاد کا ذکر ہے اور عقائد اور ایمانیات کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ لیکن جب آنحضرتؐ مدینہ میں تشریف لائے اور وہاں ایک آزاد سلطنت قائم کی تو خدا نے اپنی شریعت بھی بھیجی جو اس نئے معاشرے کے لیے ضروری تھی اور پھر یہ شریعت بھی تدریجاً دس سال کی مدت میں نازل ہوئی اور اکثر احکام وقت اور حالات کے اعتبار سے نازل ہوئے تاکہ ان کے قبول کرنے میں مسلمانوں کو کوئی گرانی یا حرج محسوس نہ ہو۔ لہٰذا اگر بعض آیات کا وقت نزول معلوم بھی ہو گیا تو اس سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ ان آیات کا صحیح مفہوم تو جب ہی معلوم ہوگا کہ ان کو وہیں رکھ کر سمجھا جائے جہاں ان کو اللہ کے رسولؐ نے رکھا ہے۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ تمام کاوشوں کے باوجود ایک تہائی بھی ایسی آیات نہیں جن کا نزول یقین سے ثابت کیا جا سکے۔ تو پھر اس ظن اور تخمین سے کیا فائدہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ترتیب نزولی کی یہ ورزش صرف قرآن میں فساد کا دروازہ کھولنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح کا کام مغرب میں ابھی تک جاری ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پیرس یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر بلاشیر نے قرآن کا فرانسیسی زبان میں ایک ترجمہ اور تفسیر شائع کی ہے۔ (Regis Blachere, Le coran, Paris, 1966) اس کے ساتھ تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ترجمہ قرآن میں اس نے بھی بیل کی پیروی کی ہے اور بیل کے بعد جتنی نکتہ چینی مستشرقین نے کی ہے ان تمام کو اس میں سمو لیا ہے۔

اس کے علاوہ مقدمہ میں اس نے بہت سی نئی باتیں بھی لکھی ہیں جو نولڈ کیے سے رہ گئی تھیں۔ اس طرح یہ کتاب مستشرقین کے تفسیری کمالات کا بہترین نمونہ بن گئی ہے۔ کتاب کو چھپے ایک عرصہ گذر گیا ہے مگر کسی مسلم مفسر یا طالب قرآن نے اس پر جامع تنقید نہیں کی۔ شرق اوسط اور افریقہ کے تمام مسلم ممالک میں فرانسیسی زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جہاں کے لوگ یقیناً بلاشیر کا ترجمہ اور تفسیر پڑھتے ہوں گے۔ لیکن کسی عرب عالم نے اس کی طرف قابل ذکر توجہ نہیں کی۔

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ دور حاضر کے مسلم مفسرین اور علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ مستشرقین کے علمی کاموں کا جائزہ لے کر ان کی غلطیوں سے آگاہ کریں۔ اور قرآنی ہدایت اور احکامات کے روشن پہلوؤں کو دنیا کے سامنے پیش کریں، جن سے مستشرقین نے یا تو غفلت برتی ہے یا جان بوجھ کر ان پر پردہ ڈالا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے یا قصداً ان میں تحریف کی ہے۔ یہ کام اس لیے بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو علوم دین سے شغف رکھتا ہے اور جدید تعلیم سے بھی بہرہ مند ہے اور خصوصاً وہ لوگ جو ان مستشرقین کے سامنے زانوے ادب طے کرتے ہیں۔ ان کی سوچ و فکر پر ان کے یہ یہودی و نصرانی اساتذہ بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مغرب میں قرآن کی تفسیر کی یہ کوششیں ان لوگوں کے نقطہ نظر سے خواہ کچھ بھی ہوں جدید مسلم مفسرین کی راہ میں وہ ایک بڑی رکاوٹ اور ان کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہیں۔

تفسیر جدید:

پچھلے سو برس میں دنیا میں جو سیاسی اور تمدنی، علمی اور سائنسی تغیرات ہوئے ہیں ان کا اثر اسلام پر بھی پڑا ہے دوسرے ادیان کی طرح خود دین اسلام کی تشریح و تفسیر بھی کافی حد تک متاثر ہوئی ہے یہ اس لیے کہ دور حاضر میں ہزار ہا تمدنی قانونی اور اخلاقی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جن کے متعلق ہماری پرانی کتابوں میں نہ کوئی تذکرہ ہے اور نہ کوئی حل اس لیے پچھلی ایک صدی کے اندر جب دنیا کے مسلمان ان مسائل سے دوچار ہوئے تو مسلم فقہاء، علماء اور مفسرین نے اس بات کی طرف توجہ کی کہ اسلام کو نئی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کی ایسی تفسیر و تشریح کی جائے جس کی روشنی میں آج کے مسائل سمجھ میں آسکیں۔

تاہم بعض علماء نے قرآن مجید کو نئے دور کے انسان کے سامنے پیش کرنے کی اچھی کوششیں کی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے اہم کام محمد عبدہ اور رشید رضا مصری کا ہے۔ جنہوں نے تفسیر المنار لکھی۔ اس تفسیر کا ابتدائی حصہ محمد عبدہ کے قلم سے ہے اور باقی تفسیر ان کے شاگرد رشید رضا نے اپنے استاد کے لیکچروں کی روشنی میں مرتب کی ہے۔ اگرچہ یہ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے لیکن صرف سورہ توبہ تک کی تفسیر ہے۔ تاہم دور جدید میں قرآن مجید کی سب سے جامع، علمی اور انتہائی نفیس تفسیر ہے۔ بلکہ یہ تمدن جدید کے مسائل کے اعتبار سے بھی بہت اچھی تفسیر ہے۔

زمانہ حال میں قرآن کی بہت سی تفسیریں سامنے آئی ہیں مگر ان میں مسائل حاضرہ کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ ان تفسیروں میں خاص طور پر ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں ایک یہ کہ یہ کسی خاص دینی ادارے کی ترجمانی کرتی ہیں یا کسی خاص سیاسی مذہبی تحریک کی عکاسی کرتی ہیں۔ ہمارے علماء جدید تمدن اور افکار سے باخبر نہیں رہتے۔ جہاں تک جدید مسائل کا تعلق ہے وہ یا تو ان کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں یا پھر ایسی تشریح کرتے ہیں جو قابل عمل نہیں ہے۔ اکثر یہ بھی کہتے ہیں کہ نئے مسائل بالکل بیکار ہیں ان کی طرف

توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لیے پرانی قدریں ہی بہتر اور کافی ہیں۔ ہماری پرانی تفسیروں میں جو کچھ لکھا ہے ہمارے معاشرے کی ضرورت کے لیے وہی کافی ہے۔

تفسیر اور تحریف جدید:

اس دور میں مسلم علماء کا ایک اور طبقہ پیدا ہوا ہے جو قرآن کی نئی تفسیر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس طبقے میں وہ لوگ ہیں جو جدید تعلیم سے آراستہ ہیں اور مغرب کی اونچی تعلیمی ڈگریوں سے مزین ہیں۔ انہیں نہ تو عربی زبان و ادب میں مہارت و بصیرت حاصل ہے اور نہ ہی انہوں نے دینی علوم کا خاص مطالعہ کیا ہے۔ مگر وہ بڑی جرأت سے قرآن کی نئی تفسیر پیش کرتے ہیں ان کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اس وقت گرد و پیش میں ان کے ملک اور معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو وہ قرآن سے ثابت کریں خواہ قرآن میں سرے سے ان امور کا تذکرہ نہ ہو۔ اسی طرح یہ لوگ زمانہ حاضر کے علمی اور سائنسی انکشافات اور تمدن اور عمرانیات کے نئے نظریات کی شرح بھی قرآن میں ڈھونڈتے ہیں۔ ملکی سیاست اور اس کے عملی انتظامات کو قرآن سے سند مہیا کرنے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیتے ہیں۔ تحریف کی یہ جدید کوشش بہت خطرناک ہے ہمارے خیال میں مستشرقین کی معاندانہ کوششوں سے بھی زیادہ نقصاندہ ہے یہ کوشش احیائے اسلام کے نام پر کی جاتی ہے۔ ان مسلم محرفین کا مقابلہ اور بھی زیادہ مشکل ہے۔

پچھلے دو سو برس میں دنیا حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو چکی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے صرف سائنسی اور عملی فنون میں ہی نہیں بلکہ علوم اور عملی زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست، معیشت، عائلی زندگی، معاشرے کی عام تشکیلات اور زندگی کے عام رجحانات کے بارے میں نظریات و تصورات بڑی حد تک بدل چکے ہیں۔ بہت سی پرانی قدریں بے معنی ہو گئی ہیں۔ زندگی کے بہت سے طریقے متروک ہو چکے ہیں اور بہت سارا علم بھی بیکار اور توہم بن کر رہ گیا ہے۔ نئے علوم اور انکشافات کی روشنی میں دین کے بہت سے متداول اور مروجہ قدریں اور اصول و قواعد عقل و تجربے اور حقیقت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ آج دنیا کی اکثر سوسائٹیوں میں دین کی ضرورت ہی سرے سے محسوس نہیں کی جاتی۔ ایسے میں اس امر کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے کہ دنیا کے لوگوں کو یہ محسوس کرایا جائے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس سے ان کی زندگی کے اصلی اور بنیادی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھ کر اسلام کی تشریح و تعبیر کی جائے جس سے لوگ صرف متاثر ہوں بلکہ انہیں اس بات کا کامل یقین ہو جائے کہ کامل ہدایت صرف اسلام ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مل سکتی ہے۔ یہی دین ان کی اس دنیا میں بھی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس نئے دور میں جو جدید تفسیریں لکھی گئیں ہیں یا لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں نوے فیصد پرانی باتوں کی تکرار ہے۔ وہ جدید صرف اس لیے ہیں کہ عصر جدید میں لکھی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ عصر جدید کی صحیح نمائندگی نہیں کرتیں۔ ان میں زمانہ حاضر کے مسائل کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔

نتیجتاً یہ ہمارے دور کی ضرورت کو پورا نہیں کرتیں۔ اسی لیے یہ مسلم معاشرہ میں کوئی تبدیلی برپا نہیں کر سکیں۔ لہذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت خالص علمی انداز میں قرآن مجید کی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن کی ایسی تفسیر جس کا خطاب تمام اہل عالم سے ہو۔ قرآن کی اساسی تعلیمات اس کے مقاصد اور افکار کو مربوط اور خالص علمی انداز میں پیش کیا جائے جس سے دنیا متاثر ہو۔

....

زوج اور سوت دو متقابل اصطلاحیں

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ و التفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

سوکن، سوتن یا سوت وہ الفاظ ہیں جو ہماری زبان میں رائج ہو کر ہماری معاشرت کا حصہ بلکہ خاصہ بن چکے ہیں۔ بدقسمتی اور لاعلمی سے ہم نے اسے فطرت اور شریعت بھی سمجھ لیا ہے۔ چونکہ سوت یا سوکن کے الفاظ منفی مطالب و مفاہیم پر مشتمل ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں سوکن یا سوت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام میں جو تصور دیا گیا ہے کہ وہ سوت کی بجائے زوج کا ہے۔ لیکن کم فہموں نے زوج کو سوت پر محمول کر رکھا ہے۔ پھر سوت کے لفظ سے سوتاپا (اردو) اور سوتیا ڈاہ (ہندی) کے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ جس کے معنی ہیں۔ دو سوکنوں کے درمیان کی دشمنی۔ (۱)

کتابستان انگلش ڈکشنری میں اس کے معنی بایں الفاظ لکھے گئے ہیں۔ Heart Burming Caused by Co-Wife۔ علمی لغت میں سوت کے لفظ کے ساتھ، جو محاورے درج کیے گئے ہیں۔ ان میں بھی منفی معنی موجود ہیں۔ مثلاً "سوت بھلی نہ سوتیلا/ ڈا۔ یعنی سوکن کی اولاد سوکن سے بھی بری ہوتی ہے۔ سوت کا لانا جی کا جلانا۔ یعنی دوسری عورت کو لانا۔ پہلی کو زندہ در گور کرنے کے برابر ہے"۔ (۲) کتابستان اردو انگلش ڈکشنری میں لکھا گیا ہے۔ سوت پر سوت اور جلا پا یعنی (۳)A third Co-wife is worse then the second for the first one.

سوکن یا سوت کا لفظ، اردو زبان میں اس بیوی کے لیے بولا جاتا ہے، جو پہلی بیوی پر لائی جائے۔ اسی طرح ایک خاوند کی دو بیویاں بھی باہم سوکن کہلاتی ہیں۔ اردو ادب میں سوکن کے لفظ کے ساتھ بھی کئی کہاوتیں مشہور ہیں۔ مثلاً سوکن بری ہے چون کی اور ساجھے کا کام، بگاڑا کریل کا اور بدری کی گھام۔ یعنی سوت برائے نام ہو تو بھی بری ہے۔ یہی حال شرکت کے کام کا ہے۔ کریل کا نٹا اور برسات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی گھمس بھی اچھی نہیں (گھام ۔ گھمس ۔ پسینہ) (جامع الامثال)

سوکن جلتی جائے اور سوتیلا نہ بکتا جائے ۔ یعنی سوکن کے مقابلے میں اسکی اولاد سے زیادہ دکھ پہنچتا ہے۔

(ماخوذ: مجمع الامثال)

سوکن تو چون رچونی کی بھی بری ۔ یعنی سوت چاہے ناچیز اور کمتر ہو، بہر حال گوارا نہیں ۔ نہ جانے کس وقت نقصان پہنچا دے ۔ حریف بہر صورت حریف ہے۔

سوکن جلایا، کس کو بھایا ۔ یعنی سوکن کی اولاد سے محبت نہیں ہوتی۔

سوکن زہر کی چھری، ایک بھی بری ۔۔۔ سوکن مرگئی آنکھ چھوڑ گئی ۔ (۴)

اسلام کے تعدد ازواج کے تصور کو بے رحمانہ بلکہ ظالمانہ ثابت کرنے کے لیے، سوکن یا سوت کے لفظ کا جو استعمال بلکہ سوء استعمال کیا گیا ہے ۔ وہ دراصل وحی خداوندی کے تقدس کو پامال کرنے کی سازش معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ مذکورہ بالا ساری کہاوتیں اور محاورے دراصل ہندوستانی معاشرت کے عکاس ہیں ۔ اس طرح کی کہاوتیں اور محاورے آپ کو عربی زبان وادب میں نہیں ملیں گے ۔ کیونکہ ان کے ہاں زوج اولین کی موجودگی میں زوج ثانی کا تصور، مذکورہ بالا محاوروں اور کہاوتوں کے مطابق نہیں ۔ ان کہاوتوں میں ہندی الفاظ کی آمیزش سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سوکن کے تعلق سے یہ سطحی تخیلات، گھٹیا تصورات اور منفی نظریات کہاں سے آئے ہیں اور کس معاشرت کی چغلی کھاتے ہیں۔

بلاشبہ ہندوستان کی مسلم معاشرت پر مذہب غیر کی معاشرت اثر انداز ہوئی ہے اور اس نے ان کے زبان وادب میں اپنے منفی کلچر کا عکس منتقل کیا ہے ۔ اس لیئے قرآنی اجازت، کے باوجود مسلمانوں کے ہاں بھی دوسری شادی کا تصور تقریباً نا قابل قبول بن کر رہ گیا ہے۔

وحی خداوندی کی رو سے دوسری شادی کا تصور اپنی روح کے اعتبار سے ایک مثبت عمل تھا اور ہے ۔ جسے جہالت کے سبب، ہماری معاشرت میں منفی سمجھا گیا ہے ۔ اس لیئے نا کحین ثانی کو بالعموم اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔ نکاح ثانی کے خلاف معاشرہ کی اس سپورٹ نے اس خالصتاً فطری اور شرعی عمل کو جنسی ہولناکی اور عورت پر ظلم کا عنوان دے رکھا ہے ۔ اور اس ردعمل سے معاشرے میں غیر فطری اور غیر شرعی رویوں نے فروغ پایا ہے۔

ہمارے خیال میں نکاح ثانی کو سوکن کے تصور سے مملو کرنے والوں نے دراصل قرآنی حسن معاشرت کے تصور کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کیونکہ سوکن کا مروجہ تصور، غیر اسلامی معاشرہ میں تو ممکن ہے ۔ اسلامی معاشرے میں اسکی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں نکلتی ۔ کہاں تعدد ازواج کا قرآنی تصور اور کہاں

ہماری معاشرت میں سوت کا تصور ۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

لفظ سوت کے اثرات ہمارے معاشرے پر اچھے نہیں پڑے ۔ اور اس سوت سے سوتیلا اور سوتیلی کے الفاظ بنائے گئے ۔ اس لیئے ناممکن تھا کہ سوت سے مشتق ہونے والے الفاظ میں اس کے بنیادی معنی نہ پائے جاتے ۔ یہی وجہ ہے کہ سوتیلا اور سوتیلی میں بھی سوت کی منفی معنویت پوری طرح موجود ہے ۔ جبکہ لفظ سوتیلا کے مقابلہ پر اسلام نے اخیافی اور علاتی کی اصطلاحیں پیش کی ہیں ۔ (یعنی ماں شریک یا باپ شریک) اور یہ تفریق بھی بنائے ضرورت ہے تا کہ وراثت کے موقع پر جائز حقداروں کو ان کا حق دیا جا سکے ۔ اور ان ہر دو الفاظ میں کسی قسم کا منفی مفہوم بھی شامل نہیں ہے ۔ لیکن ہماری معاشرت میں رائج سوتیلا کے لفظ میں تفریق کے ساتھ نفرین کا معنی بھی ارکاب ہوتا ہے ۔ یعنی سوت کی نسبت کا مفہوم بھی ۔ جو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی حریف سمجھ لیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت میں چونکہ سوتیلا کے مقابلہ پر ماں شریک یا باپ شریک کے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں ۔ اس لیئے ماں یا باپ کی نسبت سے پکارے جانے والے بچوں میں باہمی نفرت و وحشت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ ۔ کیونکہ اس میں ماں یا باپ کی نسبت کا لحاظ جو ہوتا ہے ۔ برخلاف سوتیلے بچوں کے کہ جن میں سوت کی نسبت ملحوظ ہوتی ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ سوت کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے اس لیئے سوتیلے کو بھی اچھا نہیں سمجھ سکتے ۔ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مفہوم کے لیئے ادا کیے جانے والے الفاظ یا اصطلاحات نہ صرف اپنے اندر اپنے وضع کی پوری تاریخ رکھتے ہیں، بلکہ وہ اثرات کے اعتبار سے معاشرت پر مستولی بھی رہتے ہیں ۔ کوئی معاشرہ بھی ان لفظوں کے اثر سے خالی نہیں ہوتا ۔ لفظوں کی اثر آفرینی اور طاقت پر سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

مسلم معاشرہ کی اپنی الگ پہچان ہے جو اپنے معتقدات ونظریات اور قانون تعامل سے پہچانا جاتا ہے ۔ اس کے رسم و رواج اور عرف وعادت بھی اس کے لیئے شناخت کا کام انجام دیتے ہیں لیکن مسلم سماج میں لفظوں کے غلط انتخاب کے باعث اگر کوئی مثبت عمل، منفی معنی دینا شروع کر دے، تو اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ کو ان الفاظ کا متبادل فراہم کریں، تا کہ منفی الفاظ کو ترک کیا جا سکے۔

چونکہ سوت اور سوتیلا کے الفاظ میں جس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے وہ منفی طرز عمل کے سوا کچھ نہیں ۔ جبکہ یہی حقیقت قرآن مجید میں ایک مثبت عمل کے طور پر بیان ہوئی ہے ۔ اس لیئے معاشرہ میں رائج ان اصطلاحات کو شرف بہ قرآن کرتے ہوئے، تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے ۔ ان اصطلاحات کے ترک سے معاشرہ میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہونے کے امکان کو بہر حال رد نہیں کیا جا سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید نے کسی خاوند کی پہلی بیوی کو جس طرح زوج کہا ہے اسی طرح اسکی دوسری بیوی کو بھی زوج ہی کہا ہے۔ سوت نہیں کہا۔

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج۔ (النساء/۲۰)

اور جب تم ایک بیوی کو دوسری بیوی سے بدلنا چاہو۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ شوہر کی زندگی میں آنے والی ہر بیوی، خواہ وہ پہلی ہو یا دوسری، بطور زوج کے ایک مستقل حیثیت اور مقام کی مالک ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ پہلی بیوی زوج ہو اور بعد میں آنے والی سوت ہو یا دونوں ایکدوسرے کی سوت ہوں۔ یہ تصور قرآن کے مطابق اس لیئے نہیں ہے کہ قرآن نے رشتۂ ازدواج کو لزواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ (الروم/۲۱) اور لیسکن الیھا (الاعراف/۱۸۹) کے الفاظ سے اسکی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رشتۂ ازدواج میں تمہارے لیئے تسکین اور باہمی مودّت ورحمت رکھی گئی ہے۔ پھر بمطابق قرآن یہ رشتہ بالعموم صورت احدیٰ میں قائم ہوتا ہے۔ اور گاہ بگاہ صورت تعدد میں بھی۔ اس لیئے دونوں صورتوں میں تسکین اور باہمی مودّت ورحمت کا عنصر یکساں طور پر تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ مرد کی اگر ایک بیوی ہو تو وہ تسکین کا باعث ہو۔ اور اگر دو ہو جائیں تو موجب تکلیف بن جائیں۔ اگر صورت معاملہ یہی ہوتی تو اللہ علیم وخبیر، رؤف ورحیم ایسا حقی نفرت آگیں، وحشت خیز، اور جنگی حکم کبھی نہ دیتا۔

غور کیجئے! اگر دو یا دو سے زائد بیویاں اپنی اصل میں ایکدوسرے کی حریف، رقیب اور دشمن ہوں تو ان کے مابین منافرت، منافقت اور منازعت کیا ان کے شوہر پر اثر انداز نہیں ہوگی؟ جس کے نتیجہ میں وہ شوہر، اپنی بیویوں سے بجائے تسکین پانے کے، تکلیف نہیں پائے گا؟ اور اس طرح تعدد ازواج کا حکم، ایک حتمی حکم بلکہ شریعت اسلامی کے نقص کا ایک چلتا پھرتا ثبوت نہیں بن جائے گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارا شاخسانہ لفظ سوت کے اس تصور کا ہے کہ جس نے اسلام کے تعدد ازواج کے تصور کو گہنا دیا ہے۔

عورتوں کے لیئے ان کے شوہروں کی پہلی بیویوں کے بیٹوں کے حق میں قرآن نے جو الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ وہ قابل توجہ ہیں۔ او ابناء بعولتھن۔ یا شوہروں کے بیٹے (النور/۳۱) یہ نہیں کہا کہ سوتیلے بیٹے۔ یعنی بیٹوں کو 'سوت' سے نہیں بلکہ ان کے شوہروں سے نسبت دی گئی ہے۔ مگر مذہب غیر کی معاشرت کے زیر اثر ہم اس رشتے کو اپنے پن کی بجائے سوتیلے پن کا رشتہ سمجھے بیٹھے ہیں اور اس لیئے دوسری شادی کو معیوب سمجھتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں اپنے تئیں سوتیلا رشتہ وجود میں آتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرہ کی جہالت ہے۔ قرآن کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح 'ربائب' کا لفظ دیکھئے:

وربائبکم التی فی حجورکم من نسائکم۔ (النساء) اور تمہاری عورتوں کی وہ بیٹیاں، جو ان کے پہلے شوہروں سے ہوں اور تمہاری پرورش اور تربیت میں ہوں۔

اس آیت میں لفظ 'ربائب' توجہ طلب ہے۔ یہ ربیبہ کی جمع ہے۔ جو فعیل کے وزن پر معنی مفعول میں ہے۔ یعنی مربوبہ" جس کا مطلب ہے وہ لڑکی جس کی پرورش اور تربیت کی جائے اس لیئے یہ خوشگوار فریضہ انجام دینے والے مرد (باپ) کو 'راب' کہتے ہیں۔

'امام راغب کے بقول لفظ راب'' اور رابّہ'' خاوند اور بیوی دونوں سے مخصوص ہے۔ جس وقت کہ وہ پہلے زوج کے بچے کی پرورش اور تربیت کریں۔ اس معنی پر وہ بچہ بھی ربیب یا ربیبہ کے لفظ سے مخصوص ہے۔

واختص الرابّ والرابّۃ'' باحد الزوجین اذا تولی تربیۃ الولد من زوج کان قبلہ والربیب والربیبۃ بذلک الولد۔ (۵)

اس کا مادہ 'ربّ'' ہے، جس کے بارے میں المفردات میں لکھا گیا ہے۔

الربّ فی الاصل التربیۃ وھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حدّ التمام (۶)

ربّ اصل میں پالنے اور تربیت کرنے والے کو کہتے ہیں یہ وہ ہستی ہے۔ جو کسی چیز کو بتدریج ترقی دیتے ہوئے کمال کی آخری حد تک پہنچادے۔

اور اس معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی رب کہلانے کا مستحق نہیں۔ الحمد للہ رب العلمین۔ اور قرآن مجید نے والدین کو جو چھوٹا رب، کہا ہے کما ربیانی صغیرا۔ (اسراء/۲۴) اسکی اصل بھی یہی ہے کہ ماں باپ بھی اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت اسی انداز میں کرتے ہیں کہ انہیں اپنی حیثیت، توفیق اور بساط کے مطابق، آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچاتے ہیں۔

وضاحت مذکورہ سے بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لفظ 'ربیبہ' اپنے اندر صدفی صد مثبت مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی ربیبہ وہ رشتہ ہے۔ جو اپنی حقیقی اولاد کے مماثل مفہوم کا حامل ہے۔ اس میں 'سوتیلے پن' کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ پھر یہ کہ اسے عورت کے پہلے شوہر سے منسوب کیا گیا ہے اس لیئے بھی اسمیں سوتیلے پن کا کوئی تصور اخذ نہیں ہوتا کہ مردوں کے لیئے 'سوت' کا لفظ نا قابل استعمال ہے۔ چنانچہ جو لوگ ربیبہ کا مطلب 'سوتیلی لڑکی' سے ادا کرتے ہیں۔ وہ قرآنی لفظ کے معنوی حسن وکمال کو غارت کرتے ہیں۔ اس غارت گری کا ایک نمونہ 'علمی اردو لغت' میں ربیب کے معنی میں ملاحظہ ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوتیلا بیٹا، جو پہلے خاوند سے ہو۔

اس مثال میں وہی غلطی پائی جاتی ہے جو زوج اُخریٰ کو سوت کے لفظ سے تعبیر کرنے میں لوگوں سے ہوئی تھی، مگر افسوس کہ یہ غلطی صرف اردو لغت و ادب تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہمارے تفسیری ادب تک جا پہنچی، تفسیر نعیمی میں لکھا ہے۔

''یہاں ربیبہ سے مراد وہ لڑکی ہے جو اپنی بیوی کے پیٹ سے ہو، دوسرے خاوند سے یعنی سوتیلی بیٹی، چونکہ عموماً سوتیلی لڑکی ماں کے ساتھ رہتی ہے، اور سوتیلا باپ ہی اسکی پرورش کرتا ہے۔ اس لیئے ربیبہ کہتے ہیں''۔(۷)

مذکورہ بالا عبارت میں سوتیلی بیٹی، سوتیلی لڑکی اور سوتیلا باپ، کے الفاظ سے جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے لفظ ربیبہ کی قرآنی معنویت کا حسن و جمال ماند پڑ گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر لکھا گیا ہے۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ مذکورہ عبارت میں مسلمانوں کی معاشرت میں ہندی معاشرت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے اردو کے تفسیری ادب میں یہ الفاظ، بانداز دگر، سوکنوں کے تعلق سے دوسرے مفسرین کے ہاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی 'جمع بین الاختین کی ممانعت کی علت'، کے زیر عنوان رقمطراز ہیں:

''قرآن حکیم انسانی فطرت کے اس تقاضے کو ابھارنا چاہتا ہے کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو۔ وہاں باہمی ارتباط کی فطری بنیاد رأفت و رحمت ہی ہونی چاہیئے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان اسباب کو دبا دیا جائے جو رحمی رشتوں کے اندر رشک و رقابت کا زہر گھولنے والے ہوں۔ چونکہ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کی قید نکاح میں ہونے کی صورت میں اس کا غالب امکان ہے کہ دو بہنیں، بہنیں ہوتے ہوئے بھی سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا ہو جائیں، اس وجہ سے اس کا دروازہ بند کر دیا ہے۔''(۸)

پیر محمد کرم شاہ الازہری رقمطراز ہیں:

''دو بہنوں کو خواہ وہ حقیقی ہوں یا رضاعی، ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، اور حضور کریم ﷺ نے پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کا ایک عقد میں جمع کرنا ممنوع فرمایا ہے اور اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ رشتے محبت و پیار کے رشتے ہیں، اگر یہ ایک دوسرے کی سوکنیں بن جائیں گی تو محبت و انس کی جگہ حسد و عناد، جو عام طور پر سوکنوں میں پایا جاتا ہے رونما ہو جائے گا۔''(۹)

تفسیر نمونہ کے مفسر ارقام فرماتے ہیں:

''اسلام نے اس قسم کی شادی سے کیوں روکا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ دو بہنیں طبعی اور فطری نسبی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں گی تو وہ پہلی فطری محبت باقی نہ رہے گی بلکہ ایک قسم کا تضاد ان میں جنم لے گا جو انکی زندگی کے لیئے انتہائی مضر ہے کیونکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے جذبہ محبت اور جذبۂ رقابت ان کے دلوں میں باہم برسر پیکار رہیں گے''۔(۱۰)

مولانا غلام رسول سعیدی ارقام فرماتے ہیں:

''اس نکاح کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ رحم کے رشتے ہیں اور سوکنوں میں عداوت اور جلاپا ہوتا ہے، سو اگر دو بہنوں، خالہ اور بھانجی دونوں کو ایک نکاح میں جمع کر لیا جائے تو یہ صلۂ رحم کے منافی ہے اور قطعیت رحم کو مستلزم ہے''۔(۱۱)

دو حقیقی، علاتی، اخیافی اور رضاعی بہنوں نیز خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کے بیک وقت نکاح میں جمع نہ کرنے کی حکمت آپ نے مذکورہ بالا مفسروں کی زبانی ملاحظہ فرمائی۔ اس کا خلاصہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمالیں۔ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کے نکاح میں ہونے کی صورت میں بہت ممکن تھا کہ دو بہنیں، بہنیں ہونے کے باوجود، سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا ہو جاتیں۔ اور سوکنیں بننے کی صورت میں ان میں باہمی محبت و انس کی جگہ حسد و عناد رونما ہو جاتا، جو عام طور پر سوکنوں میں پایا جاتا ہے۔ سوکن بن جانے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جاتیں، ان میں ایک قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا جو ان کی زندگی کے لیئے انتہائی مضر ہوتا۔ چونکہ سوکنوں میں عداوت اور جلاپا ہوتا ہے جو صلہ رحمی کو ختم اور قطع رحمی کو لازم کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے مذکورہ مفسرین کی تفسیروں میں آپ نے سوکنوں کے الفاظ و تصورات ملاحظہ فرمائے جو سب کے ہاں متفقہ طور پر منفی مفاہیم و مطالب پر مشتمل ہیں۔ دراصل ہم یہی دکھانا چاہتے تھے کہ ہمارا تفسیری ادب بھی اپنے علم و فضل کے باوصف معاشرتی رویوں اور اردو لغت و ادب کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکا ہے۔

ان حوالوں کا حاصل یہ نکلا کہ سوکنوں کا رشتہ چونکہ اچھا نہیں ہوتا۔ اس لیئے اللہ رب العزت نے دو بہنوں میں اسے پسند نہیں فرمایا مگر ساتھ ہی یہ نتیجہ بھی نکلا کہ دو بہنوں کے سوا باقی خواتین میں باہمی جلاپے، رشک و رقابت، حسد و عناد اور زندگی کے تضاد پر مشتمل اس منفی رشتے کو پسند کر لیا گیا ہے۔ (ہم اس

© rasailojaraid.com